دینی اور دنیاوی کاموں میں ہمیشہ سچ اختیار کرو

(فرمودہ 15 مارچ 1940ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"انبیاء کی جماعتوں کی علامتوں میں سے ہمیشہ ایک علامت راست بازی ہوتی ہے اور یہ علامت ایسی ہے جو اپنی ذات میں بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف اس کے ذریعہ جماعت کی عزت بڑھتی ہے دوسری طرف اس سے تبلیغ کے لئے بھی رستے کھلتے ہیں۔ مگر بہت لوگ ہیں جو راست بازی کی قدر کو نہیں سمجھتے۔ خصوصاً عورتوں میں یہ مرض بہت زیادہ ہے۔ مردوں میں بھی ہے مگر عورتوں میں بالخصوص زیادہ ہے۔ وہ بات کرتی ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور چھپا لیتی ہیں یا اگر بات مُنہ سے نکل جائے تو تحقیقات کے وقت اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مردوں میں بھی اس زمانہ میں یہ مرض کافی مقدار میں ہے کیونکہ یہ زمانہ مداہنت اور نفاق کا زمانہ ہے۔

تہذیب کے معنے آجکل یہ سمجھے جاتے ہیں کہ بات کرنے والا دوسرے کے خیالات کا اس حد تک خیال رکھے کہ سچائی بھی چھپانی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ ایک دوست کے متعلق جو انگلستان میں تبلیغ کرنے کے بعد واپس آئے ہیں کسی نے سنایا کہ وہ کہتے تھے وہاں ایک گلی سے دوسری گلی میں جانے تک سات بار جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ وہاں رواج ہے کہ جب کسی سے ملتے ہیں تو موسم کا حال ضرور دریافت کرتے ہیں۔ پہلا سوال عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ

موسم کیسا ہے؟ حالانکہ سارے اسی جگہ رہتے ہیں مگر پھر بھی ملیں گے تو موسم کا حال ضرور پوچھیں گے۔ اسی رواج کے مطابق کچھ عرصہ قبل تک ہندوستان میں بھی یہ حالت تھی کہ جب علاقہ کے زمیندار کبھی ڈپٹی کمشنر سے ملتے تو وہ ہر ایک سے موسم کا حال ضرور دریافت کرتا اور پوچھتا بارش ہوئی ہے یا نہیں؟ موسم کیسا ہے؟ اور اس طرح ملاقات کا قریباً آدھا وقت اسی میں گزار دیتا۔ ملنے والا حیران ہوتا کہ دو منٹ کی تو ملاقات تھی جس میں سے ایک منٹ موسم کا حال دریافت کرنے میں گزار دیا۔ ادھر افسر یہ سمجھتا کہ اگر میں یہ دریافت نہ کروں تو بدتہذیب سمجھا جاؤں گا۔ وہ چاہتا کہ میں اپنا دُکھڑا سناؤں۔ اور یہ بارش اور موسم کے متعلق دریافت کرنے میں ہی وقت گزار دیتا۔ ڈپٹی کمشنر تو اپنی طرف سے اس کی خاطر داری کرتا اور زمیندار کے دل میں اس طرح وقت کے ضائع ہونے پر شکوہ پیدا ہو رہا ہوتا۔ یہ انگلستان کے رواج کے مطابق بات تھی۔ وہاں ملتے وقت موسم کا حال ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں موسم بڑی جلدی جلدی بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح سندھیوں اور بلوچیوں میں یہ طریق ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک کہتا ہے حال دے اور وہ سنانا شروع کرتا ہے کہ فلاں کا یہ حال ہے فلاں کا یہ حال ہے اور اس طرح سب تفاصیل بیان کرنے کے بعد اسے کہتا ہے کہ تُو حال دے اور پھر وہ اپنی کہانی سناتا ہے اور جب سب کچھ اُگل دیتا ہے تو دوسرے سے کہتا ہے حال دے اور اس طرح اس کا پیٹ خالی کراتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے سے پوچھتے جاتے ہیں ختم نہیں کرتے اور یہ عادت اس قدر عام ہے کہ مجھے ایک پولیس کے افسر نے بتایا کہ یہاں یہ حال ہے کہ اِدھر چور کو پکڑنے کے لئے نکلو اور اُدھر اسے خبر پہنچ جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر ایک بھی سندھی کو پتہ لگ جائے تو دوسرے سے ملنے پر جب وہ حال دریافت کرتا ہے تو سب باتیں بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دے گا کہ فلاں تھانیدار فلاں چور کو پکڑنے جا رہا ہے اور راستہ میں اسے جو جو ملے گا اور حال دریافت کرے گا وہ ہر ایک کو یہ بات بھی بتائے گا اور پھر ان میں سے جسے بھی دوسرے کو حال بتانے کا موقع آئے وہ یہ بات بھی اسے ضرور سنائے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تھانیدار تو بعد میں پہنچے گا مگر یہ خبر پہلے ہی سارے ضلع میں پہنچ جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں چور بھلا کیوں بیٹھا رہے گا؟ اس پولیس افسر نے بتایا کہ

یہاں یہ بڑی سخت دقّت ہے ہمیں چھپ چھپ کر جانا پڑتا ہے۔

انگلستان میں اس حال دے کے بجائے موسم کا حال پوچھنے کا رواج ہے۔ تم اگر گھر سے نکلو اور راستہ میں تمہیں ایک ایسا شخص ملے جسے دردوں کا عارضہ ہے یا گنٹھیا کی شکایت ہے اور سردی کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کہے گا کیسا برا موسم ہے اور تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ چاہے خود اُس وقت لطف ہی آرہا ہو مگر تم کہو یہی کہ بہت ہی برا موسم ہے۔ آگے گئے تو ایک اور شخص ملا جو ہٹا کٹا تندرست مشٹنڈا ہے۔ اس پر سردی بُرا اثر نہیں کرتی اور وہ کہتا ہے کہ اوہ! کیسا نفیس موسم ہے۔ اُس وقت تمہارا فرض ہے کہ کہو کہ ہاں بہت ہی اچھا موسم ہے۔ آگے جا کر ایک نے کہا کہ آج بارش ضرور ہو گی تو تم کو کہنا پڑے گا ہاں ضرور ہو گی۔ لیکن اور آگے جا کر کوئی اور ملا اور اس نے کہا کہ آج تو بارش کے کوئی آثار نہیں۔ تو تم چند قدم پیچھے جو یہ کہہ چکے ہو کہ ضرور بارش ہو گی اب یہ کہنے پر مجبور ہو کہ نہیں ہرگز نہیں ہو گی۔ آج تو بارش کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو یہ بات دراصل تہذیب سمجھی جاتی ہے کہ جس کے ساتھ بات کی جائے اس کا دل خوش کرنے کا اتنا خیال رکھا جائے کہ خواہ اس کے لئے صداقت چھوڑنی پڑے اس میں تأمل نہ ہو۔ یہاں ہندوستان میں بھی اب یہ بات بہت پیدا ہو رہی ہے۔ بعض احمدی کسی تعلیم یافتہ آدمی کو کئی کئی سال تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ بہت ہی قریب آچکا ہے لیکن جب کوئی موقع پیدا ہو وہ شدید دشمن ثابت ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یورپین تہذیب کے مطابق وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جب اسے کہا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے ہیں تو وہ بھی یہی بات کہے اور جب کہا جائے کہ حضرت مرزا صاحب نے فلاں فلاں معجزات دکھائے، وہ خدا تعالیٰ کے محبوب اور مُحِبّ تھے تو تہذیب کے خلاف سمجھتا ہے کہ اس بات کی تردید کی جائے لیکن جب مقابلہ کا وقت آتا ہے تو اس کا اندرونہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن یورپ میں جہاں یہ نقص ہے وہاں بعض خوبیاں بھی ہیں۔ وہاں بعض اصول مقرر ہیں اور وہ لوگ اس طرح ان کی پابندی کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بسا اوقات وہ اصول متضاد بھی ہوتے ہیں مثلاً جہاں یہ دستور ہے کہ موسم کے معاملہ میں کوئی جو کچھ کہے اس کی تائید کر دی جائے وہاں یہ بات بھی ہے کہ عام حالات میں وہ لوگ سچ بولنے کے عادی ہیں۔

موسم کا حال بیان کرنے میں تو ایک انگریز بے شک غلط بیانی کرے گا مگر گواہی کے معاملہ میں نسبتاً سچ بولے گا اور عدالت کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔ ہمارے ملک میں یہ بات نہیں۔ یہاں عدالتوں میں بھی بہت دغا اور فریب ہوتا ہے۔ سچا بھی عدالت میں جا کر جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹا بھی، پولیس بھی جھوٹ بولتی ہے اور گواہ بھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجسٹریٹوں کو بھی بعض اوقات جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ہر طرف جھوٹ کا ایک طوفان بپا ہوتا ہے۔ سچائی کو سچ ثابت کرنے کے لئے بھی ضرور جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص کسی سرکاری عدالت میں سچ کے ساتھ مقدمہ نہیں جیت سکتا خواہ اس کا کیس بالکل ہی سچا کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے جھوٹ کی بنیاد ایسے اصول سے قائم کی گئی ہے کہ جھوٹ مجبوراً بولنا پڑتا ہے۔ اگر کسی شخص کے خلاف دس بارہ جھوٹے گواہ پیش ہو جائیں جو کہیں اس نے فلاں شخص کو مارا ہے تو گو اس نے نہ مارا ہو جب تک وہ بھی ایسے گواہ پیش نہ کرے جو کہیں اس نے نہیں مارا وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اور ضروری نہیں کہ سچے کے پاس گواہ موجود ہوں اس لئے اسے ضرور جھوٹے گواہ بنانے پڑتے ہیں۔ اگر تو مارنے والا خود ہی سچا بیان دے دے کہ اس نے گالی دی اور میں نے مارا تو عدالت کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسے صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اشتعال کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اگر تو وہ سمجھے کہ اشتعال ایسا تھا کہ اس کے مقابلہ میں اتنا مارنا زیادہ نہیں تو وہ سزا میں کمی کر سکتا ہے اور اگر اس کے نزدیک اشتعال کافی نہ ہو تو سزا سخت دے سکتا ہے۔ اور یورپ میں عام طریق یہی ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ اگر دو آدمی اکیلے لڑ پڑیں تو فوراً ایک کے دس بارہ دوست جھوٹی گواہی دینے پر تیار ہو جائیں گے کہ ہم وہاں موجود تھے اور فلاں شخص نے ہمارے سامنے فلاں کو مارا تھا۔ اب اگر سچ بولنے والا اکیلا ہی ان کے مقابلہ میں کہتا جائے کہ مَیں نے نہیں مارا تو مجسٹریٹ اس کی ہرگز نہیں سنے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے سچ کی تائید کے لئے بھی اتنے ہی گواہ ہوں۔ یہاں فیصلہ اس کے حق میں ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ جھوٹی شہادت مہیا کر سکے۔ اگر تو جس نے مارا ہے وہ زیادہ معززین کو جھوٹا بنا سکے تو وہ کامیاب ہو جائے گا اور اگر نہ مارنے والا زیادہ معززین کو جھوٹا بنا سکے گا تو وہ جیت جائے گا۔ جیت کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ کون شخص زیادہ تعداد میں اور

معزز آدمیوں کو جھوٹا بنا سکا ہے۔ مجسٹریٹ بھی آخر انسان ہوتا ہے اور قانون یہ ہے کہ شہادت کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس لئے بسا اوقات وہ سمجھتا بھی ہے کہ کیس جھوٹا ہے مگر وہ مجبور ہوتا ہے کہ سچے کے خلاف فیصلہ کرے۔ بعض ممالک مثلاً فرانس وغیرہ میں یہ قاعدہ ہے کہ مجسٹریٹ خود بھی تحقیقات کرے۔ اسلام کا قانون بھی یہی ہے اور فرانس چونکہ اسلامی حکومت کے قریب تھا اس لئے شاید اس نے وہاں سے یہ طریق لیا ہو لیکن انگریزی قانون یہ ہے کہ شہادت کے مطابق فیصلہ کیا جائے مجسٹریٹ کوئی دخل نہ دے بلکہ اگر وہ دخل دے تو اسے متعصب سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے بعض اوقات مجسٹریٹ یہ جاننے کے باوجود کہ بات جھوٹ ہے سزا دے دیتا ہے کیونکہ قانون یہی ہے۔ مَیں نے کئی پولیس والوں سے سنا ہے کہ ہم نے کبھی جھوٹا مقدمہ نہیں بنایا۔ پہلے اطمینان کر لیتے ہیں کہ مقدمہ سچا ہے اور پھر اس کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے جھوٹے گواہ بناتے ہیں۔ اگر کوئی چور خود ہی مال پولیس کے حوالے کر دے تو عدالت اسے چھوڑ دے گی۔ اس لئے پولیس کو مجبوراً یہ کہانی بنانی پڑتی ہے کہ یہ مال فلاں جگہ دفن تھا جو فلاں فلاں ذیلدار، نمبردار یا زمیندار کے روبرو ملزم نے نکال کر دیا اور ظاہر ہے کہ جب ملک کے عام حالات یہ ہوں تو سچ کو قائم رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔

دنیا میں آج تک جتنے انبیاء گزرے ہیں مَیں سمجھتا ہوں ان سب کی امتوں سے زیادہ اس زمانہ میں سچائی کے ساتھ وابستگی کو قائم رکھنا مشکل ہے۔ صحابہ کرام کی حالت اور تھی۔ عرب میں پہلے بھی سچ کی عادت تھی۔ گو عرب لوگ چوری، ڈاکہ، زنا، شراب خوری، جوابازی وغیرہ جرائم میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے مگر سچائی کے پابند تھے۔ بہت سی بُری عادات کے ساتھ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ سچ کے پابند تھے اور پھر مہمان نواز بھی تھے، چور بھی تھے، ڈاکو بھی، شرابی اور زانی اور جواری بھی مگر ساتھ مہمان نواز اور سچ بولنے والے بھی تھے۔

حضرت خلیفہ اول سنایا کرتے تھے کہ ایک شخص نے خود اُن سے بیان کیا کہ حج کو جاتے ہوئے رستہ میں مَیں قافلہ سے الگ ہو گیا۔ میرا سامان قافلہ کے ساتھ چلا گیا اور میرے پاس کچھ نہ تھا۔ کئی روز کے فاقہ کے بعد مجھے ایک بدوی ملا۔ ریگستانی علاقوں میں دس دس بیس بیس میل پر چھوٹے چھوٹے سرسبز قطعات بھی ہوتے ہیں اور بدو وہیں اپنی رہائش رکھ لیتے ہیں۔

کنال دو کنال کا ٹکڑا ہوتا ہے جہاں زمین کے اندر پانی کی دھاریاں اس طرح چلتی ہیں کہ وہ علاقہ سر سبز رہتا ہے، بدوی وہاں رہائش رکھتے ہیں۔ اس شخص نے بیان کیا کہ جب وہاں پہنچا تو ایک بدوی بیٹھا تھا۔ اس نے تربوز بوئے ہوئے تھے۔ ایسی جگہوں میں بدو لوگ ایسی چیزیں ہی بوتے ہیں جو دور شہر میں لے جا کر فروخت کی جا سکیں اور جلدی گل سڑ نہ جائیں۔ یہ شخص وہاں پہنچتے ہی گر گیا اور اشارہ سے کہا کہ مجھے کچھ کھانے کو دو۔ بدوی کے پاس اور کچھ کھانے کو تو تھا نہیں بکریوں کا دودھ تھا جو اس نے اسے پلایا۔ اس کے بعد اس خیال سے کہ یہ دودھ سیال چیز ہے کوئی ٹھوس چیز بھی اسے کھلانی چاہیئے وہ تربوزوں میں داخل ہؤا اور کئی تربوز توڑ توڑ کر پھینکتا گیا کیونکہ وہ ابھی پکے نہ تھے۔ آخر ایک پکا ہؤا تربوز تلاش کر کے اسے کھلایا اور اس کے بعد تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شخص بہت حیران ہؤا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بدو نے کہا کپڑے اتارو اور کرتہ وغیرہ اتروا کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ پاس کوئی چیز ہے تو نہیں اور پھر کہنے لگا کہ یہ تربوز جو مَیں نے تمہاری خاطر توڑ کر پھینک دیئے ہیں میرے بیوی بچوں کی سال بھر کی غذا تھی۔ دراصل وہ لوگ گزارہ تو دودھ وغیرہ پر ہی کر لیتے ہیں اور یہ تربوز وغیرہ شہر میں لے جا کر فروخت کر کے کچھ پیسے بالائی ضروریات کے لئے حاصل کر لیتے ہیں۔ بدوی نے اس سے کہا کہ جب تم میرے پاس آگئے تو یہ بات میری مہمان نوازی کی شان کے خلاف تھی کہ میں پہلے تم سے کچھ پوچھتا۔ لیکن اب اگر معلوم ہو جاتا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اور تمہارے پاس مال ہے تو مَیں تمہیں ضرور مار ڈالتا۔ مَیں نے اپنے تمام تربوز تمہاری خاطر اُجاڑ دیئے ہیں اور بظاہر اب میرے بیوی بچوں کے لئے موت ہے۔

تو گو وہ لوگ قاتل تھے، شرابی اور زانی تھے مگر سچائی اور مہمان نوازی ان میں عام تھی۔ دیکھو رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے متعلق قیصر کے سامنے ابوسفیان نے کس طرح سچی شہادت دے دی۔ باوجودیکہ وہ اُس وقت کافر تھے۔ گو وہ کہتے ہیں کہ اگر میرا بس چلتا تو میں جھوٹ بھی بول دیتا مگر پیچھے قوم کے دوسرے لوگ کھڑے تھے اور مَیں سمجھتا تھا اگر میں نے جھوٹ بولا تو یہ لوگ فوراً میری تردید کر دیں گے مگر اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہ حیثیت قوم وہ لوگ سچے تھے۔

اب کیا حالت ہے کہ اگر ایک غیر احمدی مولوی جھوٹ بولتا ہے تو سب اس کی تائید شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ابوسفیان سمجھتا تھا کہ اگر مَیں نے جھوٹ بولا تو میرے ساتھی اسے برداشت نہیں کریں گے اس لئے صاف طور پر اقرار کیا کہ محمد (ﷺ) بڑے اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ قیصر نے دریافت کیا کہ کیا اس نے کبھی کوئی معاہدہ کر کے اسے خود ہی توڑ بھی دیا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کبھی نہیں۔ پھر اس نے پوچھا کیا اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا بڑھ رہے ہیں۔ پھر قیصر نے دریافت کیا کہ اس کا تعلق کیسے خاندان سے ہے؟ ابوسفیان نے کہا بڑے اعلیٰ خاندان سے۔ قیصر نے دریافت کیا کہ اس کے ساتھ شامل ہونے والا کوئی شخص اس وجہ سے بھی الگ ہؤا ہے کہ اسے اسلام کے اصول پسند نہیں آئے؟ کسی شکوہ شکایت لڑائی جھگڑے کی وجہ سے علیحدگی اور بات ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کیا کوئی ایسا شخص بھی علیحدہ ہؤا ہے جسے اسلام کے عقائد پسند نہ آئے ہوں؟ ابوسفیان نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔1 تو اس زمانہ میں سچائی عام تھی مگر آج جھوٹ عام ہے۔

مجھے ہمیشہ اس واقعہ سے حیرت ہوتی ہے رسول کریم ﷺ ایک مرتبہ وحی لکھوا رہے تھے۔ کاتبِ وحی لکھ رہا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر کاتب کے مُنہ سے فوراً یہ فقرہ بے اختیار نکل گیا کہ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔ اتفاقاً اگلی آیت یہی تھی۔ اس لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ بس یہی الہام ہے لکھ لو۔ اس بات پر اسے ٹھوکر لگ گئی۔ اس نے سمجھا کہ میرا فقرہ پسند آ گیا تو اسے ہی الہام میں داخل کر لیا اور وہ مرتد ہو کر مخالفوں میں جا ملا۔ مخالف ہونے کے بعد وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اور بھی ایسے فقرے مجھ سے آپؐ قرآن کریم میں لکھوا لیتے رہے ہیں۔2 مگر نہیں وہ صرف یہی ایک واقعہ بیان کرتا تھا۔ تو عرب بحیثیت قوم جھوٹے نہ تھے مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ آج اگر کوئی شخص مرتد ہو تو وہ فوراً کچھ کی کچھ بات بنا دے گا۔

ایک دفعہ یہاں ایک شخص طالب علم کی حیثیت سے حیدرآباد سے آیا۔ آج وہ لیڈر بنا ہؤا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہاں کسی سے اس کا جھگڑا ہو گیا اور وہ لاہور جا پہنچا۔ جھگڑا اس کا غالباً ہوسٹل والوں سے ہؤا تھا مگر لاہور جا کر اس نے اعلان کیا کہ مَیں قادیان گیا تھا۔

شروع شروع میں تو مجھ سے اصل بات پردہ میں رکھی گئی مگر کچھ عرصہ کے بعد جب خلیفہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ میں مخلص احمدی بن گیا ہوں تو مجھے بیت الفکر کے ایک کونہ میں بٹھا کر کہنے لگے کہ آج مَیں تم پر مخلص احمدی کا راز منکشف کرنا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ ہمارا اصل عقیدہ یہی ہے کہ مرزا صاحب آنحضرت ﷺ سے افضل ہیں۔ حالانکہ جب وہ یہاں سے گیا تو دیانتداری سے اصل بات بھی بتا سکتا تھا کہ میرا ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہو سکا۔ اس لئے ان میں نہیں رہ سکا۔ لیکن اسے چھپا کر اس نے اتنا بڑا افتراء کیا جو زبان سے نکالتے ہوئے ایک شیطان خصلت انسان کا دل بھی کانپ جاتا ہے۔ یہ ہندوستانی ذہنیت ہے کہ جھوٹ بولنے میں دریغ نہیں کیا جاتا۔ باقی مرتدین کو بھی دیکھ لو۔ اِدھر مرتد ہوئے اور اُدھر سینکڑوں قصے گھڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ سوال قرضہ یا مقدمہ یا نوکری یا کسی بچے کی نوکری یا شادی بیاہ کا ہوتا ہے مگر ہزاروں باتیں پاس سے ہی بنا کر ایسا گورکھ دھندا پیش کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ تو آجکل جھوٹ بہت عام ہے اور سچ کے قیام کے لئے بہت سی مشکلات درپیش ہیں لیکن اگر قوم سچ کے لئے تیار ہو جائے تو اس کا اثر بھی بہت بڑا ہو گا۔ اگر یہ مشکل کام ہماری جماعت کر لے تو اس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ اگر ہر فردِ جماعت سچ کی پابندی اختیار کرے، عورتیں بچوں کو سچ بولنا سکھائیں، بہنیں بھائیوں کو بھائی بہنوں کو اور باپ بیٹوں کو اور چاہے کسی عزیز ترین رشتہ دار کے متعلق سچی گواہی دینی پڑے اس میں دریغ نہ کریں تو اس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بعید ترین واقف کے لئے بھی جھوٹ بولنے میں تأمل نہیں کرتے۔

میرا تجربہ یہی ہے کہ ہماری جماعت میں دوسروں کی نسبت سچائی بہت زیادہ ہے اور فیصلوں میں بالعموم وہ دقتیں پیش نہیں آتیں جو دوسرے لوگوں کے معاملات میں آتی ہیں مگر پھر بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو جھوٹ بول لیتے ہیں۔ لیکن ایک نقص ہماری جماعت میں بہت عام ہے اور وہ بدظنی ہے۔ میں نے دیکھا ہے ہر شخص یہی کہتا ہے کہ جی قاضی نے عمداً غلط فیصلہ کیا حالانکہ مَیں نے سو فیصدی اس بات کو غلط پایا ہے کہ جان بوجھ کر کسی قاضی نے بددیانتی کی ہو۔ مگر مجھے کوئی فیصلہ کرانے والا شاید ہی ایسا ملا ہو جس نے یہ نہ کہا ہو کہ قاضی نے بددیانتی کی ہے

یا رعایت کی ہے یا توجہ نہیں کی۔ یہ سب الفاظ قریباً ہم معنی ہیں مگر میرے تجربہ میں یہی آیا ہے کہ یہ بات غلط ہوتی ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے قاضیوں کے فیصلے غلط بھی ہوئے ہیں، بعض نے گواہی پوری نہیں لی ہوتی یا ایسی جرح ہونے دی ہے جو نہیں چاہیئے تھی مگر یہ سب باتیں عام حالات کے ماتحت تھیں۔ یہ مَیں نے نہیں دیکھا کہ جان بوجھ کر کسی نے کوئی بد دیانتی کی ہو۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کبھی کسی قاضی نے کوئی حرکت بد دیانتی سے نہیں کی ہو گی۔ ممکن ہے کی ہو مگر وہ ایسی ہی ہو گی جو مجھے نظر نہیں آئی۔ انسان کمزور ہے کمزوریاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی مگر وہ ایسی باریک کہ ان کا پکڑنا مشکل ہے۔ تو بیشتر حصہ جماعت کا سچ ہی بولنے والا ہے مگر کئی لوگ ایسے بھی میں نے دیکھے ہیں جو جھوٹ بول لیتے ہیں اور سچی بات ان کے مُنہ سے اسی طرح نکالنی پڑتی ہے جس طرح شیر کے مُنہ میں سے گوشت کا لوتھڑا۔ جس میں ہاتھ بھی زخمی ہو جائیں۔ وہ چبا چبا کر بات کریں گے اور پھر جرح پر کوئی بات بتائیں تو بتائیں گے اور پھر جب دریافت کیا جائے کہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تو کہیں گے کہ جی خیال نہیں کیا تھا۔ دھیان نہیں تھا۔ ان کے مُنہ سے سچی بات کہلوانا ایسا ہی مشکل ہوتا ہے جیسا شیر کے مُنہ سے گوشت کا لوتھڑا نکالنا مگر بیشتر حصہ سچ بولنے والا ہے۔ گو وہ بھی سچائی کے اس معیار پر نہیں جو قرآن کریم قائم کرنا چاہتا ہے مگر نسبتاً دوسروں سے اچھے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ جب تک وہ سچائی کا کامل معیار اختیار نہیں کرتے دوسروں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

سچائی کے قیام کے لئے پہلے خود مثال قائم کرنی چاہیئے۔ جو ماں بچہ کے سامنے خود جھوٹ بولتی ہے اس کی نصیحت کا بچہ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ بعض مائیں بچوں کو ایسی تعلیم دیتی ہیں جو جھوٹ ہو مثلاً کہہ دیا کہو اماں گھر نہیں ہیں یا ہاتھ سے روپوں کی پوٹلی باندھتی جاتی ہے اور بچہ سے کہتی جاتی ہے کہ کہہ دو ہمارے ہاں روپیہ نہیں ہے۔ اس کا بچہ سچ بولنا کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ پس سچائی کی تعلیم دینے کے لئے خود بھی سچ اختیار کرنا ضروری ہے۔

مذہبی مسائل میں بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ مجھے آج یہ بات بیان کرنے کا خیال "الفضل" میں مولوی غلام حسن خان صاحب پشاوری کا مضمون پڑھ کر ہؤا۔ مَیں نے دیکھا ہے ان کے مضمون میں ایک بے ساختہ پن ہے وہ صاف کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک غلطی

ہوئی مگر جب مجھے پتہ لگ گیا میں نے اصلاح کر لی لیکن ان کے مقابل پر مولوی محمد علی صاحب بھی مضامین لکھتے ہیں اور کہتے ہیں نہیں آپ کو غلطی نہیں لگی تھی حالانکہ مولوی غلام حسن خان صاحب کی پوزیشن بالکل مضبوط ہے۔ انہوں نے ایک وقت بیعت نہیں کی تھی اور دوسرے وقت کر لی۔ اور جو شخص یہ مان لے کہ پہلے میں غلطی پر تھا اس پر اعتراض کیا ہو سکتا ہے؟ مگر مولوی محمد علی صاحب برابر اعتراض کرتے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی جلدی تبدیلی آپ کے اندر کیونکر پیدا ہو گئی؟ وہ اس بیعت پر بدظنی کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں شاید ان کا کوئی فائدہ ہے حالانکہ اگر بیعت کر لینے میں کوئی فائدہ نظر آتا تو وہ حضرت خلیفہ اول کی بیعت کیوں نہ کر لیتے؟ پہلے میرا خیال تھا کہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی بیعت کی ہوئی تھی۔ سندھ کے سفر میں بھی کسی دوست نے پوچھا تھا تو میں نے کہا تھا کہ میرا خیال ہے کی ہوئی تھی مگر آج ان کے مضمون سے پتہ لگا ہے کہ نہیں کی تھی۔ مولوی غلام حسن خان صاحب نے مولوی محمد علی صاحب کو جواب دیا ہے کہ آپ کو علم ہے مَیں نے حضرت خلیفہ اول کی بھی بیعت نہیں کی تھی۔ اگر میرے دل میں کوئی بد دیانتی ہوتی تو مَیں اُسی وقت کیوں نہ بیعت کر لیتا مگر میں نے اس وقت بھی دلیری سے کام لیا اور نہ کی۔ لیکن اب کہ مَیں نے سمجھا بیعت ضروری ہے مَیں نے کر لی اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ پہلے میں غلطی پر تھا۔ اب اس میں اعتراض کی بات ہی کون سی ہے؟ یا تو مولوی محمد علی صاحب یہ فیصلہ کر دیں کہ انسان کبھی غلطی کر ہی نہیں سکتا اور اگر کر سکتا ہے تو اس کی اصلاح کونسا جرم ہے؟ اور ان کے مقابلہ میں خود مولوی محمد علی صاحب کی کیا پوزیشن ہے؟ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی بیعت کی اور ان کے احباب نے یہ اشتہار دیا کہ یہ بیعت مطابق الوصیت ہے۔ مگر آج وہ خلافت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ الوصیت کسی ایک فرد کی خلافت کے خلاف ہے۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے کہ ہم نے اس وقت الوصیت کے مطابق خلافت سمجھی تھی مگر اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ عقیدہ غلط تھا۔ اسی طرح وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تو آپ کو نبی اور رسول لکھتے رہے، عدالت میں حلفیہ بیان دیا اور کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحب نبی ہیں مگر اب کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگ تو شروع سے ہی

آپ کو نبی نہیں مانتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ سچائی سے کام لیتے تو ان کی پوزیشن بہت زیادہ مضبوط ہوتی۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم پہلے ایسا سمجھتے تھے اس لئے اس کا اظہار بھی کرتے تھے مگر اب پتہ لگ گیا ہے کہ وہ ہماری غلطی تھی مگر وہ ایک واقعہ کا جو ہو چکا ہے انکار کرتے ہیں جس سے ان کی پوزیشن کس قدر خراب ہو جاتی ہے۔ ہم یہ معاملہ کسی ثالث کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہیں۔ مذہبی مسائل میں تو ہم ثالثوں کے قائل نہیں مگر یہ کوئی مذہبی سوال نہیں بلکہ بعض عبارتوں کے مفہوم کا سوال ہے اور اردو ادب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے تیار ہیں کہ ادیبوں سے اس بات کا فیصلہ کرالیا جائے۔ ہم ان کی پہلی تحریریں ان کے پیش کر دیں گے کہ ان کا پہلا عقیدہ یہ تھا اور وہ کہہ دیں کہ میں پہلے بھی نبی نہیں مانتا تھا۔ اس کے بالمقابل وہ کہتے ہیں کہ میں پہلے نبی نہیں مانتا تھا اب ماننے لگا ہوں۔ اس کے متعلق وہ بھی جو تحریریں چاہیں پیش کر دیں اور مَیں ان کا جواب لکھ دوں گا اور پھر فیصلہ کرالیا جائے کہ ان سب تحریروں کے مفہوم وہ صحیح ہیں جو ہم پیش کرتے ہیں یا جو وہ کہتے ہیں۔ اگر ثالث یہ فیصلہ کر دیں کہ مولوی صاحب کا عقیدہ پہلے بھی وہی تھا جو اَب ہے تو ہم مان لیں گے کہ وہ صحیح کہتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی اس فیصلہ کی طرف نہیں آئیں گے۔ ان کی غرض ایسی باتوں سے صرف یہ ہے کہ ان کے پہلے عقائد اور خیالات پر پردہ پڑ جائے جیسے ملزم جب پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دشمنوں نے خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا دیا ہے۔ ان کی تحریریں موجود ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نبی آخر الزمان ہیں، مجدد ین اور ان میں یہ فرق ہے۔ مگر آج کہتے ہیں کہ میں نے کبھی یہ بات کہی ہی نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر پہلے بھی آپ نبی نہ کہتے تھے اور آپ کی تحریروں سے نبوت کا ثبوت نہیں ملتا تو ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں اور یہ کیوں کہتے ہیں کہ کسی کی تحریر یا قول کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تو چاہیئے کہ خود تحریک کر کے دوسروں کو ان کی طرف متوجہ کریں۔ وہ چونکہ جانتے ہیں کہ لوگ ان تحریروں کو پڑھ کر ضرور متاثر ہوں گے اس لئے کہتے جاتے ہیں کہ زید یا بکر کے قول کا کوئی اعتبار نہیں اور وہ حجت نہیں ہو سکتا۔ جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں۔ مولوی غلام حسن خان صاحب کے مضمون کو دیکھ کر صاف پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے

سچائی کے ساتھ واقعہ بیان کر دیا ہے جو اس قابل ہے کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ لیکن مولوی محمد علی صاحب جو مضامین لکھتے ہیں اور جس رنگ میں نبی ماننے یا نہ ماننے کا سوال پیش کرتے ہیں اس میں ایک اخفاء کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس سوال کو جانے دو کہ مَیں یا کوئی اور اس زمانہ میں کیا خیال کرتا تھا۔ حالانکہ یہ سوال نہایت اہم ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں آپ کے درجہ کے متعلق لوگوں کا کیا خیال تھا۔ ایک شخص تو غلطی کر سکتا ہے، دو کر سکتے ہیں، چار کر سکتے ہیں مگر جو مجموعی عقیدہ اس زمانہ میں پھیلا ہوُا تھا اور جس کی اخبارات، اشتہارات اور رسالوں میں اشاعت ہوتی رہتی تھی اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کی تردید نہیں کرتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس عقیدہ کو درست سمجھتے تھے ورنہ کیوں اس کی تردید نہ فرماتے۔ یا اُس وقت جماعت میں جو لوگ بڑے تھے انہوں نے اس کا ردّ کیوں نہ کیا؟ یہ باتیں مولوی محمد علی صاحب کی پوزیشن کو کمزور کرنے والی ہیں۔

سچائی ہی ہے جو ہر میدان میں انسان کو کامیاب کرتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پہلے لکھا تھا کہ مسیح ناصری زندہ ہے مگر بعد میں وفات پیش کی اور جب لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے صاف طور پر فرما دیا کہ وہ میری غلطی تھی۔ جب تک مجھے علم نہ تھا میں وہی کہتا رہا جو جمہور مسلمانوں کا عقیدہ تھا مگر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا تو میں نے اسے بیان کر دیا۔ اسی طرح پہلے آپ لکھتے رہے کہ میں نبی نہیں ہوں مگر بعد میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ میرا تو پہلے بھی یہی مطلب تھا کہ میں نبی ہوں۔ نہیں کا لفظ کاتب نے غلطی سے لکھ دیا بلکہ سادگی سے اقرار کر لیا کہ مسلمانوں کے پرانے عقیدہ کے مطابق میں اپنے آپ کو نبی نہیں سمجھتا تھا مگر خدا تعالیٰ کی بارش کی طرح وحی نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہیں رہنے دیا۔ اسی طرح اگر مولوی محمد علی صاحب بھی یہی پوزیشن اختیار کرتے تو ان پر بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا مگر وہ تو کہتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی حضرت مرزا صاحب کو نبی نہیں سمجھا۔ ایک طرف تو یہ لوگ ہم پر شرک کا الزام لگاتے ہیں دوسری طرف ان کا یہ حال ہے کہ نبیوں اور ماموروں کی طرف غلطی کا منسوب کرنا تو جائز سمجھتے ہیں مگر اپنی صریح غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ صریح لکھے ہوئے حوالے موجود ہیں۔ ایسی واضح

تحریروں سے انکار دراصل ان پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہے ورنہ اگر یہ کہتے کہ ہاں ہم نے نبی لکھا ہے اور ضرور لکھا ہے مگر وہ غلطی تھی اب بات ہماری سمجھ میں آگئی ہے تو ان کی بات معقول سمجھی جاتی مگر ان کی موجودہ پوزیشن کو دیکھ کر تو ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ سچائی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

پس دینی اور دنیاوی ہر قسم کے معاملات میں سچائی کو مقدم رکھنا نہایت ضروری ہے اور یہ بات ہر میدان میں انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ ماں باپ اور استادوں کو چاہیئے کہ بچوں میں سچائی کی عادت پیدا کریں۔ اکثر بچے جھوٹ ماں باپ یا استاد سے ہی سیکھتے ہیں۔ دس فیصدی دوسروں سے اور نوے فیصدی ماں باپ یا استادوں سے سیکھتے ہیں۔ ہمسایہ لڑکوں سے بھی سیکھتے ہیں مگر چونکہ ان کے لئے ان کے دلوں میں ادب اور احترام نہیں ہوتا اس لئے ان کا اثر اتنا گہرا نہیں ہوتا جتنا ماں باپ اور استادوں کا ہوتا ہے۔ صرف دس فیصدی مثالیں ایسی ملیں گی کہ بچوں نے ہمسایہ بچوں سے جھوٹ سیکھا یا نوکروں سے سیکھ لیا ورنہ نوے فیصدی ماں باپ اور استادوں سے سیکھتے ہیں۔ جو ماں باپ ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ نقصان کے باوجود سچ بولتے ہیں ان کے شریف الطبع بچے اکثر سچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح استاد کا اثر بھی بہت ہوتا ہے کیونکہ بچے کے دل میں ان تینوں کا احترام ہوتا ہے۔ غور کر کے دیکھ لو ہر انسان جو حرکتیں کرتا ہے ان میں سے اکثر اس کے ماں باپ یا استاد میں ہوں گی اور اس نے ان کی نقل میں وہ حرکت اختیار کی ہو گی۔ بعض لوگ ایک خاص طرح کندھا ہلاتے ہیں یا سر ہلاتے ہیں یا ایسی ہی اور حرکات کے عادی ہوتے ہیں اور اگر تحقیق کی جائے تو یہ ثابت ہو گا کہ یہ حرکات اکثر انہوں نے ماں باپ یا استاد کی نقل میں اختیار کی ہوں گی۔ بچہ بوجہ احترام ہمیشہ ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے یہ بڑے ہیں میں بھی ان کی نقل کر کے بڑا بن جاؤں گا۔ تو اگر ماں باپ اور استاد سچائی پر قائم ہو جائیں تو نوّے فیصدی سچ دنیا میں قائم ہو سکتا ہے۔ باقی صرف دس فیصدی جھوٹ رہ جائے گا جو دوسرے ذرائع سے قائم ہوتا ہے اور اس کا علاج بہت آسان ہے۔

پس میں جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ ایسی اخلاقی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب محکمہ قضاء کے سامنے جواب دہی یا گواہی کے لئے کوئی پیش ہو تو سچ سچ بات

کہہ دے۔ مذہبی معاملات میں بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر کسی بات کا جواب ایک وقت نہیں آتا تو بناوٹی جواب دینے کی کوشش نہ کرو مَیں تو اسی طرح کرتا ہوں۔

ایک شخص نے ایک خط میرے سامنے پیش کیا جو غیر احمدی کے جنازہ کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر کہہ دیا کہ اس وقت اس کا کوئی جواب میرے ذہن میں نہیں۔ آپ کے باقی حوالوں سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ غیر احمدی کا جنازہ پڑھنا منع ہے مگر اس خط کا میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کئی دفعہ مجھے چیلنج بھی دیا گیا کہ اس کا جواب دو مگر میں نے کبھی بناوٹی جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اس میں ہتک کی کوئی بات ہے۔ ممکن ہے یہ خط بعض مخصوص حالات میں لکھا گیا ہو جو مجھے معلوم نہیں مگر بہر حال دوسرے حوالے ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر احمدی کا جنازہ آپ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس خط کو دیکھ کر میں نے یہی کہا کہ اس کا کوئی جواب میں نہیں دے سکتا اور اس میں حرج ہی کیا ہے کہ انسان سچی بات صاف صاف کہہ دے۔

ایک دفعہ لاہور میں دو شخص مجھ سے ملنے آئے۔ ایک نے دریافت کیا کہ آپ نے کس مدرسہ میں تعلیم پائی ہے؟ اس کا مطلب دیوبند وغیرہ علمی مدارس سے تھا۔ میں نے کہا کسی مدرسہ میں نہیں۔ اس نے کہا کسی سے کوئی سند حاصل کی ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ کون کون سے علوم پڑھے ہیں؟ میں نے کہا کوئی نہیں۔ اس کی غرض ان سوالات سے صرف یہ تھی کہ ظاہر کرے کہ یہ تو جاہل آدمی ہے اس سے ہم کیا گفتگو کریں۔ میں اسے یہ جواب بھی دے سکتا تھا کہ تمہیں ان سوالات کا کیا حق ہے مگر وہ پوچھتا گیا اور میں جواب دیتا گیا۔ دوست بیٹھے تھے اور وہ ایسے سوالات کرنے سے اسے روکنا بھی چاہتے تھے مگر میں نے کہا نہیں پوچھنے دو۔ اس نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تو خود مانتے ہیں کہ جاہل ہیں پھر ان سے کیا سوال کریں۔ میں نے کہا کہ ایک سوال آپ نے نہیں کیا؟ وہ بات مَیں خود بتا دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کیا؟ مَیں نے کہا میں انگریزی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور پرائمری میں بھی فیل ہوا اور مڈل میں بھی اور انٹرنس میں بھی مگر ان سب باتوں کے باوجود میں ایک چیز پڑھا ہوا ہوں۔

میں نے وہ پڑھا ہے جو محمد (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ) نے پڑھا تھا اور میں نے قرآن کریم پڑھا ہے۔ گو محمدؐ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کا مقام اعلیٰ تھا اور میرا ادنیٰ۔ بے شک میں نے دنیا کا کوئی علم نہیں پڑھا مگر نہ پڑھنے کے باوجود میرا دعویٰ ہے کہ **دنیا کا کوئی علم نہیں کہ جس کے رو سے قرآن کریم یا اسلام پر اس کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر کوئی اعتراض کرے اور میں اس کا جواب نہ دے سکوں۔** یہ بات سن کر اس شخص کے ساتھی نے کہا کہ مَیں نے تم کو اشارہ نہ کیا تھا کہ ان کے جواب میں کوئی اور بات ہے اور میں نے تمہیں پہلے منع کیا تھا کہ یہ سوالات نہ کرو۔ بعض پیغامی بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ مجھے اقرار ہے کہ میرے پاس کوئی سند نہیں مگر پھر بھی میرا یہ دعویٰ ہے کہ مجھے قرآن کریم آتا ہے جو چاہے میرے اس دعویٰ کو پرکھ لے۔ میں نے کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ مجھے فلسفہ خوب آتا ہے مجھ سے پڑھ لو یا حساب بہت آتا ہے وہ پڑھ لو۔ ہاں یہ ضرور کہا ہے کہ قرآن کریم مجھ سے ہی پڑھ سکتے ہو اور میرا کسی اور علم کا ماہر نہ ہونا کوئی ہتک کی بات نہیں۔ ایک نجار اگر لوہار کا کام نہیں جانتا تو اس میں اس کی کوئی ہتک نہیں یا اگر ایک جولاہا نائی کا کام نہیں جانتا تو اسے جاہل نہیں کہا جا سکتا۔ جو شخص جس فن کو جانتا ہے اس کے علم کا امتحان اسی فن میں کیا جا سکتا ہے اس سے باہر نہیں۔ پس میرے قرآن کریم کے سوا کسی علم میں ماہر نہ ہونے کو کوئی اگر جہالت قرار دیتا ہے تو بڑے شوق سے دے میرے لئے اس میں ہتک کی کوئی بات نہیں۔

لوگوں نے کوشش بھی کی ہے کہ مجھ سے دعویٰ کرائیں کہ میں مصلح موعود ہوں۔ مگر میں نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مخالف کہتے ہیں آپ کے مرید آپ کو مصلح موعود کہتے ہیں مگر آپ خود دعویٰ نہیں کرتے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے دعویٰ کی ضرورت کیا ہے؟ اگر میں مصلح موعود ہوں تو میرے دعویٰ نہ کرنے سے میری پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ جب میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو پیشگوئی غیر مامور کے متعلق ہو اس کے لئے دعویٰ کرنا ضروری نہیں ہوتا تو پھر دعویٰ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نے ریل کے متعلق پیشگوئی فرمائی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ ریل دعویٰ کرے؟ دجال کی پیشگوئی موجود ہے مگر کیا دجال کا دعویٰ کرنا ضروری ہے؟ ہاں مامور کی پیشگوئی میں دعویٰ کی ضرورت ہوتی ہے۔

باقی غیر مامور کو تو خواہ پتہ بھی نہ ہو کہ وہ پیشگوئی اس کی ذات میں پوری ہو گئی کوئی حرج کی بات نہیں۔

امت مسلمہ میں مجددین کی جو فہرست حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو دکھانے کے بعد شائع ہوئی ہے ان میں سے کتنے ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا ہو؟ میں نے خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے سنا ہے کہ مجھے تو اورنگ زیب بھی اپنے زمانہ کا مجدد نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس نے کوئی دعویٰ کیا؟ عمر بن عبدالعزیز کو مجدد کہا جاتا ہے کیا ان کا کوئی دعویٰ ہے؟ پس غیر مامور کے لئے دعویٰ ضروری نہیں۔ دعویٰ صرف مامورین کے متعلق پیشگوئیوں میں ضروری ہے۔ غیر مامور کے صرف کام کو دیکھنا چاہئے۔ اگر کام پورا ہوتا نظر آجائے تو پھر اس کے دعویٰ کی کیا ضرورت ہے؟ اس صورت میں تو وہ انکار بھی کرتا جائے تو ہم کہیں گے کہ وہی اس پیشگوئی کا مصداق ہے۔ اگر عمر بن عبدالعزیز مجدد ہونے سے انکار بھی کرتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنے زمانہ کے مجدد ہیں کیونکہ مجدد کے لئے کسی دعویٰ کی ضرورت نہیں۔ دعویٰ صرف ان مجددین کے لئے ضروری ہے جو مامور ہوں۔ ہاں جو غیر مامور اپنے زمانہ میں گرتے ہوئے اسلام کو کھڑا کرے، دشمن کے حملوں کو توڑ دے اسے چاہے پتہ بھی نہ ہو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مجدد ہے۔ ہاں مامور مجدد وہی ہو سکتا ہے جو دعویٰ کرے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا۔ پس میری طرف سے مصلح موعود ہونے کے دعویٰ کی کوئی ضرورت نہیں اور مخالفوں کی ایسی باتوں سے گھبراہٹ کی بھی ضرورت نہیں۔ اس میں کوئی ہتک کی بات نہیں۔ اصل عزت وہی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ چاہے دنیا کی نظروں میں انسان ذلیل سمجھا جائے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے رستہ پر چلے تو اس کی درگاہ میں وہ ضرور معزز ہو گا۔ اور اگر کوئی شخص جھوٹ سے کام لے کر اپنے غلط دعویٰ کو ثابت بھی کر دے اور اپنی چستی یا چالاکی سے لوگوں میں غلبہ بھی حاصل کر لے تو خدا تعالیٰ کی درگاہ میں وہ عزت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور جسے خدا تعالیٰ کے دربار میں عزت حاصل نہیں وہ خواہ ظاہری لحاظ سے کتنا معزز کیوں نہ سمجھا جائے اس نے کچھ کھویا ہی ہے حاصل نہیں کیا اور آخر ایک دن وہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

پس دینی و دنیوی کاموں میں ہمیشہ سچ کو اختیار کرو۔ جو شخص سچ کے لئے نقصان اٹھاتا

ہے وہ دراصل فائدہ میں رہتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں جب آتھم کی پیشگوئی پر مخالفوں نے شور مچایا کہ وہ پوری نہیں ہوئی تو ایک دن نواب صاحب بہاولپور کے دربار میں بھی جو اغلباً موجودہ نواب صاحب کے دادا تھے اس موضوع پر باتیں ہونے لگیں اور تمسخر اُڑایا جانے لگا کہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ نواب صاحب کے پیر حضرت غلام فرید صاحب چاچڑاں والے بھی تشریف فرما تھا وہ خاموش بیٹھے رہے مگر کچھ عرصہ بعد نواب صاحب بھی اس گفتگو میں دخل دینے لگے تو وہ جوش میں آگئے اور فرمانے لگے کہ تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ ایک عیسائی کی تائید اور مسلمان کے خلاف باتیں کرتے ہو۔ تم لوگ کہتے ہو کہ آتھم زندہ ہے یہ بالکل غلط ہے وہ مر چکا ہے اور مجھے تو وہ مُردہ ہی نظر آتا ہے۔3

پس جب کوئی شخص سچ کے لئے کھڑا ہو تو ہر شریف انسان اس کی عزت کرے گا۔ اگر کمینے اس کی عزت کو نہ پہچانیں تو یہ کوئی حرج کی بات نہیں۔ پس کبھی کسی دشمن کے اعتراض سے ڈر کر حق نہ چھپاؤ کیونکہ اگر تم ایسا کروگے تو تم اپنی عزت قائم کرنا چاہوگے اور خدا تعالیٰ اور رسول کی بے عزتی کرنے والے بنوگے اور اس صورت میں تم ان کی دعاؤں کے مستحق نہیں بنوگے بلکہ ان کی ناراضگی کے مورد ہوگے۔ پس سچ کو قائم کرو کیونکہ جس دن تم اسے قائم کرلوگے احمدیت کی شان اور اس کا مرتبہ بہت ہی بلند و بالا ہو جائے گا۔“

(الفضل 23 مارچ 1940ء)

---

1 بخاری کتاب الجہاد والسیر باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام

2 تفسیر القرطبی جلد 12 صفحہ 110 زیر آیت فتبارک اللہ احسن الخالقین

3 تاریخ احمدیت جلد 3 صفحہ 340